مَریاروسامینوکال

لامانچامیں کہیں ۱۶۰۵

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

[مریاروسامینوکال (María Rosa Menocal) اصلاً کیوبا کی ہیں لیکن تعلیم امیریکا میں پائی اور اب برسوں سے ییل یونی ورسٹی میں R. Selden Rose Professor of Spanish and Portuguese ہونے کے علاوہ Whitney Humanities Center کی ڈائریکٹر بھی ہیں۔ ان کے خیال میں ماہرینِ علوم ازمنۂ وسطا کی عربوں اور مسلمانوں کے ثقافتی، علمی اور ادبی کارناموں سے عام بے رخی خود دراساتِ ازمنۂ وسطا کے حق میں مضر ثابت ہوئی ہے۔ بل کہ ان کے خیال میں تو ان کارناموں سے آنکھیں چار کیے بغیر Medievalism کی بس کم مستند تاریخ ہی سامنے آسکی ہے۔ پروفیسر مینوکال نے اس بے توجہی کے ازالے کے طور پر کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں صرف وہی کتاب جس سے آنے والا باب لیا گیا ہے عام قاری کے لیے ہے۔ ان کی بقیہ تصانیف میں یہ دو بے حد اہم ہیں: *The Arabic Role in Medieval Literary History: A Forgotten Heritage* (Philadelphia: University of Pennsylvania Press, 1987) اور *Shards of Love: Exile and the Origins of the Lyric* (Durham: Duke University Press, 1994)۔ — محمد عمر میمن]

<mumemon@charter.net>

☆

مَر یاروسامینوکال

لا مانچا میں کہیں ۱۶۰۵

طلیطلہ کی سڑکیں ویران پڑی ہیں، اپنی گذشتہ کیفیت کی اب محض ایک پرچھائیں۔ ایک شخص مضافات سے ایک کتاب کی جستجو میں آیا ہے۔ ایک کتاب جس کا نام اسے ابھی معلوم نہیں لیکن یہ یقین ضرور ہے کہ اس میں ایک گم شدہ تاریخ ہوگی۔ وہ اس شہر کے تنگ اور بَل کھاتے ہوئے گلی کوچوں میں گھومتا رہا ہے جو کسی زمانے میں ایک کتب خانے سے مماثل تھا، شاید اس پہاڑی شہر کے بلند ترین مقام تک گیا ہے، اور شاید سان رومَن کے گرجے کے آس پاس تاک جھانک کرتا رہا ہے، جو اس قدیم، حالیہ متروک دارالسلطنت کی چوٹی پر واقع ہے۔ لیکن انتہائے کار اسے معلوم ہے کہ اس قسم کی اشیا کا کھوج لگانے کے لیے بہترین جگہ یہودیوں کا سابقہ محلّہ ہی ہوسکتی ہے، گو پچھلے سو سال سے یہاں کسی یہودی کا گزر نہیں ہوا ہے۔ یا کم از کم ان یہودیوں کا تو نہیں جنھیں اپنے یہودی ہونے کا اعتراف ہو، جو ایک بہت مختلف بات ہے۔ بعض اوقات بس یہ کہنے کی ایک چال ہی ہوتی ہے کہ آپ کہیں میں فلاں ہوں اور دوسرے کہیں کہ آپ کوئی اور ہیں۔ جب لوگ یہ کہنا چاہیں کہ کوئی چیز پَون چکّی ہے لیکن آپ اچھی طرح جانتے ہوں کہ یہ ایک دیو ہے، تو کوئی بھلا اس کی تردید کیسے کرسکتا ہے؟

پرانا یہودی محلّہ اس قسم کے چھلاوں سے بھرا پڑا ہے، اور یہ بات اِس آدمی کو معلوم ہے۔ آپ راستے پر آگے بڑھتے ہیں تو سانتا مَریالا بلانکا کا کونوینٹ نظر آتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کے یہ اندر سے مسجد جیسا لگتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ سان رومَن کے گرجے ہی کی طرح نعل نما محرابوں کی قطاریں اسے بھی سہارے ہوئے ہیں۔ جنوب میں قرطبہ جتنی دور جانے والے ہر شخص نے دیکھا ہے کہ نعل نما کمانوں کی یہ لامتناہی قطاریں وہاں بھی کلیسائے اُسقف کو اسی طرح سنبھالے ہوئے ہیں۔ لیکن شہر کے اس حصے میں ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ واقعی ایک کنیسہ [یہودیوں کی عبادت گاہ] ہوا کرتا تھا، ماضی کے ان دنوں میں جب یہودی کھلّم کھلّا یہودیوں کی حیثیت میں وہاں عبادت کرسکتے تھے، جب شہر کے اس حصے میں کوئی درجن بھر کنیساؤں کی بھرمار تھی۔ اور پھر تران سیتو کا شاندار گرجا بھی ہے، اپنی سفید منقّش دیواروں کے ساتھ، اسی کشادہ شاہراہ پر ذرا آگے، وہ شاہ راہ جو پہاڑ کے کنارے فصیل سے لگی لگی چلتی ہے۔ سارے شریف نصرانی، قدیم اور جدید، جواب وہاں عبادت کرتے ہیں — زیادہ تر متموّل ہی، چوں کہ یہ بڑے ٹھاٹ باٹ کی جگہ ہے — کہتے ہیں کہ یہ غرناطہ کے شاہی محلّات کی طرح نظر آتی ہے، اور ہر متنفّس اُس خطّاطی کو پہچانتا ہے، گو کہ نہ پہچاننے کا سوانگ بھرتا ہے، جو دیواروں پر ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کبھی صاحبِ ثروت یہودی یہاں عبادت کرتے تھے، وہ یہودی جو دیواروں پر ہر طرف نظر آنے والی

لکھائی کو پڑھنا جانتے تھے، دونوں طرح کی لکھائیوں کو۔

یہ آدمی ان گلی کوچوں میں اس لیے گھومتا پھر رہا ہے کہ اب یہ ردّی بیچنے والوں کا مُحلّہ بن گئے ہیں۔ پرانا کتابوں والا محلّہ، ان لوگوں کا جو کتابیں لکھتے اور دنیا کے واسطے انھیں ترجمہ کرتے تھے، اب ایسی جگہ بن گیا ہے جہاں وہ کتابیں جنھیں کسی کو نہیں پڑھنا چاہیے کاغذ بنانے کی لگدی میں تبدیل کردی جاتی ہیں۔ آدمی کو ایک لڑکا دکھائی دیتا ہے جو پہلے سے کاغذوں کا ایک انبار ریشم کے ایک بوڑھے تاجر کو فروخت کرنے کی کوشش کررہا ہے، اور وہ دیکھ سکتا ہے کہ ان کی عبارت عربی ہے۔ پڑھنے اور لکھنے کے اعتبار سے یہ ایک خطرناک زبان ہے؛ اسے اب کوئی نہیں سمجھتا، سوائے پرانے مسلمانوں کے جو، پرانے یہودیوں ہی کی طرح، ہرطرف یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وہ مسلمان بالکل نہیں ہیں، کہ وہ تو نوعیسائی ہیں۔ لیکن اس پر کون یقین کرتا ہے؟ دنیا میں کون یہ کہتا ہے کہ وہ وہی ہے جو نظر آتا ہے؟ اور جو جیسا نظر آتا ہے وہ واقعی ویسا ہی ہے؟

کاغذوں کے انبار میں کوئی چیز ایسی ہے جو آدمی کی توجہ میں آ گئی ہے۔ کیا یہ واقعی وہی ہوسکتی ہے، وہ کتاب جس کی اسے تلاش ہے، جو بس بِکنے ہی والی ہے کہ لگدی بنادی جائے؟ بہ ہرحال وہ خود تو اسے پڑھ نہیں سکتا، یا کم ازکم ان پُرخطر راستوں میں اسے پڑھتا ہوا نظر نہیں آنا چاہتا، اسے کسی ایسے فرد کو ڈھونڈنا پڑے گا جسے وہ موریسکو الہمیادو (morisco aljamiado) کہتا ہے، ان نوعیسائیوں میں کا کوئی جو ہنوز اس قدیم زبان کو پڑھ سکتے ہیں۔ موریسکوس (مورِکوچک: "little moors") وہ نام ہے جو وہ پرانے مسلمانوں کو دیتے ہیں، ان مسلمانوں کو جن سے توقّع کی جاتی ہے کہ اپنے کو بدل دیں گے؛ یہ اب بھی ہسپانیہ میں، پرانے یہودیوں کی طرح، ہرطرف پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن سب کو معلوم ہے، یا کم ازکم سب یہ سوچتے ہیں کہ انھیں معلوم ہے، کہ لوگ کیا ہیں اور کیا نہیں، انتہائے کار، سب کو پَون چکّیوں اور دیووں کا فرق واقعی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ موریسکوس عیسائی بالکل نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اب بھی اس زبان کو پڑھ سکتے ہیں جسے الہمیادو (Aljamiado) کا نام دیتے ہیں، اب اس کا جو کچھ بھی مطلب ہو۔ کیوں نہ اسے صرف ومحض عربی ہی کہا جائے اور معاملہ یک سو کیا جائے؟

اس آدمی کو بس اتنا ہی کرنے کی ضرورت ہے کہ اس محلّے میں داخل ہو—اس کا نام الکانا(Alcana) ہے جو، ہرفرد یہی کہتا ہے، کہ پرانے زمانے میں اُنھیں زبانوں کا ایک لفظ تھا جنھیں اب اور باقی نہیں رہنا چاہیے—اور اسے کوئی نہ کوئی موریسکو مل جائے گا۔ یہ آدمی ہماری طرف آنکھ سے اشارہ کرتا ہوا لگ رہا ہے کیوں کہ، جیسا کہ وہ کہتا ہے، یہاں اُس زبان کے کسی مترجم کا مل جانا بالکل دشوار نہیں۔ ''اگر مجھے کسی بہتر اور قدیم تر زبان کا مترجم درکار ہوتا تو وہ بھی مجھے مل جاتا،'' وہ رازداری سے بتاتا ہے۔ ہر متنفّس جانتا ہے— کیا نہیں؟— کہ پرانے یہودی اب بھی عبرانی پڑھ سکتے ہیں، جس طرح پرانے مسلمان اب بھی عربی پڑھ سکتے ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح لوگ اپنے کو بتاتے کچھ ہیں اور حقیقت

میں ہوتے کچھ اور ہیں— کون ان میں فرق کر سکتا ہے؟

آدمی نے جو موریسکو ڈھونڈ نکالا ہے، اس سے کہتا ہے کہ بس ترجمہ کرنا شروع کر دے۔ یہ ایک پُر خطر بات ہے کہ بیچ راستے میں کھڑے ہو کر اس ممنوعہ زبان کو پڑھا جائے، لیکن وہ آدمی جو اپنی کتاب کی تلاش میں ہے اور موریسکو دونوں ہی کسی ممکنہ دریافت کے اشتیاق میں لمحاتی طور پر کچھ غافل سے ہو گئے ہیں۔ چلیے، بقیہ کہانی خود اس آدمی کی زبانی ہی سنیں۔ بہ ہر کیف، یہ اس کی اپنی کہانی ہے اور اس سے بہتر طور پر کسی اور نے کبھی نہیں سنائی ہے۔ ہم وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں کتاب اس نے موریسکو کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے، وہیں، بیچ سڑک پر:

> اس نے اسے بیچ سے کھولا، اور تھوڑا سا پڑھ کر ہنسنے لگا۔ میں نے پوچھا کہ کس بات پر ہنس رہے ہو۔ اس نے جواب دیا، حاشیے پر یادداشت کے طور پر لکھی ہوئی ایک چیز پر۔ میں نے کہا کہ بتاؤ وہ کیا ہے اور اس نے، ہنوز ہنستے ہوئے، جواب دیا: ''حاشیے میں یہ لکھا ہے: 'کہتے ہیں کہ دُلسینیہ دیل توبوٗسو، جس کا اس تاریخ میں بڑی کثرت سے ذکر ہوا ہے، سارے لا مانچا میں سؤر کو نمک چڑھانے والی عورتوں میں بہترین تھی۔'''
>
> جب میں نے دُلسینیہ دیل توبوسو نام سنا تو مجھے تعجب ہوا اور دنگ رہ گیا۔ میں نے فوراً قیاس کر لیا کہ ہو نہ ہو ان کتابوں میں دون کیہوتے کا قصّہ شامل ہوگا۔ اس خیال کے زیرِ اثر میں نے اس سے کہا کہ شروع سے پڑھے۔ اس نے یہی کیا۔ عربی سے کستیلین زبان میں فی البدیہہ ترجمہ کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ سرخی یوں ہے: دون کیہوتے دلا مانچا کی تاریخ، نوشتہ از سیدے اَمیتے بینینہیلی، عربی مورّخ۔ جب کتاب کا عنوان میرے کانوں تک پہنچا تو مجھے اپنی مسرت کو چھپانے کے لیے غایت درجے کی احتیاط کرنی پڑی۔ میں ریشم کے تاجر کی طرف بھاگا، اور لڑکے کے تمام چرمی پارچے اور کاغذات آدھے ریال کے عوض خرید لیے، لیکن اگر اس کی عقل ٹھکانے ہوتی اور اس کے علم میں یہ بات ہوتی کہ میں کس شدّت سے ان کا خواہاں ہوں، تو چھ سے زائد ریال مانگتا اور فروخت سے یہ اسے بہ آسانی مل بھی گئے ہوتے۔ پھر میں موریسکو کو ساتھ لے کر بڑے گرجا کے حجرے میں پہنچا، اور اس سے کہا کہ ان کتابوں میں دون کیہوتے سے متعلق ہر چیز کا میرے لیے کستیلین میں ترجمہ کرو، کسی چیز کا اضافہ کرنا نہ کسی چیز کو حذف؛ اور میں نے اسے منہ مانگی رقم دینے کی پیش کش کی۔

❁

میگل دِ سیروانتس نے اپنے ناول *Don Quixote de la Mancha*، جو رسمیات کے اعتبار سے ناولوں میں مسلّمہ طور پر سب سے مستند ناول ہے، کا پہلا حصہ ۱۶۰۵ میں شائع کیا تھا۔ تقریباً فوری طور پر ہی یہ ایک غیر معمولی ہاتھوں ہاتھ لی جانے والی کتاب بن گیا۔ اس کا دوسرا حصہ ۱۶۱۵ میں منظرِ عام پر آیا، اپنے ایک جعلی تکملے (sequel) کے فوراً بعد جس نے اصلی ناول کی غیر معمولی شہرت، اور یوں اس کی گرم بازاری سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ اپنے کرداروں کی مہمات کا خود سیروانتس

کا نوشتہ تسلسل، اس کا اپنا حصہٴ دوم، تو اس کی ابتدا اس نیم طنزیہ ہجو سے ہوتی ہے جس کا ہدف ایک کیہوتے کو تصنیف کرنے کا دعوے دار ہے جو، ظاہر ہے، مستند نہیں ہے۔ یہ ایک تاریخی شرارت ہے جو عظیم ہسپانوی ناول نگار کے عین شایانِ شان ہے، اور بعض لوگ تو یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ اگر آوے یانے دا اور اس کے بھگوڑے تسلسل (sequel) کا وجود نہ بھی ہوتا، تو سیروانتس اسے خود ہی گھڑ لیتا۔ اس دخل در معقولات کرنے والے بہروپیے کا شکریہ کہ اس نے سیروانتس کو فکشن کا حقیقت سے جو تعلق ہے اس کے مسئلے پر ہمیشہ سے زیادہ کُھل کر غور کرنے کا موقع فراہم کر دیا، جس نے اصلی ناول کو آگے بڑھایا تھا اور اسے ہسپانیہ اور ہسپانیہ کے باہر اتنی بے تحاشا ہاتھوں ہاتھ بکنے والی کتاب بنا دیا تھا، خاص طور پر نئی دنیا کی خوش حال نوآبادیوں میں۔

ان طنزیہ کنایوں (ironies) میں جو ''دون کیہوتے'' کے دوسرے حصے میں بڑے دردناک طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں، شاید کوئی اُس صریح تاریخی طنزیہ کنایے جتنا تیکھا نہیں جو اس ناول کے بنیادی استعارے کی طرف رجعت کرتا ہے، وہ استعارہ جو اس ابتدائی باب میں بیان کیا گیا ہے جس میں ہمارے راوی نے دون کیہوتے دلا مانچا کی کہانی تلاش کی ہے اور پھر پا بھی لی ہے۔ سیروانتس کا پیچ دار فکشن یہ ہے کہ ناول فعلاً ایک عرب مورّخ سیدے اَمیتے بینینہلی کی کارگزاری ہے، کہ وہ کتاب جس میں دون کیہوتے دلا مانچا کی سچّی کہانی شامل ہے عربی میں لکھی گئی تھی، کہ وہ ایک بار گم ہو گئی تھی لیکن پھر بعد میں طلیطلہ کے یہودیوں کے پرانے محلے میں جواب شکست و ریخت کا شکار ہے مل گئی تھی، چیتھڑوں کے انبار میں جن کو نئے کاغذ کی شکل دی جانے والی تھی، اور جسے، بعد از آں، طلیطلہ کے راستوں پر اتفاقاً گھومتے پھرتے ہوئے ایک موریسکو نے جو ہنوز زبانِ عتیق کو پڑھ سکتا تھا ترجمہ کیا تھا۔ لیکن ۱۶۱۵ کے ہسپانیہ میں کوئی موریسکو باقی نہیں بچا تھا۔ ۱۶۰۵، جب ناول ''دون کیہوتے دلا مانچا'' پہلی بار شائع ہوا، اور ۱۶۱۵، جب سیروانتس نے اس کی ذیل شائع کی، کے درمیان ہسپانوی حکومت نے موریسکوس، یا نوعیسائیوں کو ملک بدر کر دیا تھا، اور یوں مسلمانوں کی بالجبر تبدیلیِ مذہب کی ایک پوری صدی کو انتہا آشنا کیا تھا، وہ مسلمان جنھیں ۱۴۹۲ میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔ سیاسی حالات کا کیہوتانہ طنزِ خفی ان حکومتی اعلانوں میں مضمر تھا جن میں اس تبدیلیِ مذہب کو ناکافی قرار دے دیا گیا تھا جس کا مطالبہ اربابِ حل و عقد نے اس وقت کیا تھا جب انھوں نے ۱۴۹۲ کے ہتھیار ڈالنے کے معاہدے کی شرائط میں مذہبی آزادی کی جو ذِمّیوں جیسی ضمانتیں دی گئی تھیں انھیں منسوخ کر دیا تھا۔

سیروانتس کا ۱۶۰۵ کا ''کیہوتے''، جو مکمل ناول کا حصہٴ اوّل ہے، اُس کشادہ اور پیچاک المیے کے پورے تاریخی شعور کو مدِ نظر رکھ کر لکھا گیا تھا جس کی نمائندگی طلیطلہ کا منظر کرتا تھا۔ وہاں، ایک زبردست بین المذہبی سنجوگ کے اہم مرکز ہونے کے اعتبار سے اور پورے یورپ کے واسطے ایک بے مثال مرکز الترجمہ ہونے کے اعتبار سے بھی، طلیطلہ — اور ہسپانیہ — کی گذشتہ عظمت کا نشان اس کے خرابوں میں ملتا ہے جو سترھویں صدی کے اختتام پر بالکل سامنے کی حقیقت تھے۔ وہ مخطوطے اور

کتابیں جو کبھی طلیطلہ کی بے مثال ثروت کی قلب و روح تھے، اب اتنے بے توقیر ہو چکے تھے کہ اگر کبھی سڑک پر نظر آ جاتے تو صرف اس لیے کہ انھیں ردّی میں تبدیل کر دیا جائے، اور یہ تو صرف وہ گنے چنے تھے جو نذرِ آتش ہونے سے بچ رہے تھے۔ کتب سوزی جو پچھلی صدی کے اختتام پر، غرناطہ کے سپر انداز ہو جانے کے بعد، شروع ہو چکی تھی، سروانتیس کے عدیم المثال ناول کے مشہور و معروف پانچویں باب ''احتسابِ کُتب'' میں ایک اور غایت درجے کے اشاراتی اور جانے پہچانے منظر میں دہرائی گئی ہے۔ ظاہر ہے، یہ صرف کتابیں ہی نہیں تھیں، بل کہ ان کتابوں کی زبانوں، عربی اور عبرانی، کا علم تھا جو سیروانتس کے زمانے میں ناپید ہو چکا تھا — وہی مہارت جس نے کبھی علم، اور ترسیلِ علم و تعلّم کو ممکن بنایا تھا، اور جس نے طلیطلہ کو بہت سے متمدّن لوگوں کے لیے کائنات کا مرکز بنا دیا تھا۔ کم و بیش یہی وہ ہنرمندی تھی جو آدمی کو سیروانتس کے ناول کی ذہانت سے لبریز کائنات میں، اسی ناول کے واحد بچ رہنے والے قلمی نسخے کو پڑھنے کے لیے درکار تھی۔

سیروانتس کی تماشا گاہ اس سوال کی مختلف شکلوں سے کھچا کھچ بھری تھی کہ آیا چیزیں ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی نظر آتی ہیں، جیسی ہونے کا دعوا کرتی ہیں، جیسی ہم انھیں چاہتے ہیں کہ ہوں، جس طرح انھیں پانا لوگوں کی ضرورت ہو۔ یہ مفہوم، جسے اس قدر پیچیدگی کے ساتھ ناول میں سرتا سر چھانا بینا گیا ہے، بڑی نفاست اور پرکاری کے ساتھ عربی مخطوطے کے مترجم کی ذات میں بھی خلاصتاً پیش کر دیا گیا ہے جس میں دون کیہوتے کی ''سچّی کہانی'' موجود ہے۔ ناموسوم موریسکو الہمیا دو تاریخی اعتبار سے اس قول کی تقریباً مکمل مادّی تجسیم تھا کہ حقیقت اور فسانے کی باہمی تشکیل پذیری ہی دراصل اس ناول کا بنیادی مسئلہ ہے۔ موریسکوس اس ملک میں ان آخری مسلمانوں کے اخلاف تھے جو آزادانہ اپنے مذہب کی پیروی کر سکتے تھے، وہ ملک جو ۱۴۹۲ میں متحد عیسائی ہسپانیہ بن گیا۔ ۱۴۹۹ کے آتے آتے، مذہبی آزادی کی جو ضمانتیں سپر اندازی کے معاہدے میں دی گئی تھیں، جس پر فیردیناند اور ایسا ویلا نے دستخط کیے تھے، بڑے بہیمانہ طور پر کالعدم قرار دے دی گئی تھیں۔ نتیجے میں، ہسپانیہ کا تمدّنی منظرنامہ بڑے بنیادی طور پر از سرِنو ترتیب دیا گیا جو آنے والی صدی کے پورے دورانیے میں مسلمانوں کی بالجبر تبدیلیِ مذہب اور بیچ چوراہوں پر عربی کتابوں کی آتش زنی سے عبارت تھا۔ یہ وہ صدی بھی تھی جس میں نئی دنیا چھانی بینی، اور پھر نو آبادکاروں سے بسائی جا رہی تھی، ایسے آبادکاروں سے جو غالب طور پر ان جنوبی صوبوں سے آئے تھے جو کبھی الاندلس کا مرکزی علاقہ رہ چکے تھے۔ آنے والی صدی کے دوران (وہ صدی جس کو ہسپانیہ کے عظیم روشن خیال اَمیریکو کاسترو کے مطابق ''عہدِ تضادات'' (*La Edad conflictiva* "The Conflictive Age") کا عہد ہونا چاہیے، نہ کہ زیادہ روایتی ''عہدِ زرّیں''، جو علماے ہسپانیات میں استعمال ہوتا ہے) موریسکوس مسلمان تھے بھی اور نہیں بھی تھے، بالکل اپنے یہودی جوڑی دار کونوریسوس کی طرح۔

بہت سے ہسپانوی، بھانت بھانت کے اور ہر پس منظر سے آنے والے، اس طرح ایک ایسی آئینہ خانہ دنیا میں آ پھنسے

تھے جسے فرامین کے ایک مستقل سلسلے نے تخلیق کیا تھا۔ یہ فرامین لوگوں سے اس بات کے طلب گار تھے کہ وہ ایسے جھوٹ کی کھلّم کھلّا پیروی کریں جو پانی کی طرح شفّاف ہو، اپنے ہاتھوں خود کو فنا کرنے والی دیوانگی کی ایسی کیفیت جو سیروانتس جیسے تخلیقی ادبی نابغہ کے شایانِ شان ہی ہو سکتی تھی۔ نوعیسائی تشخّص کے اقرارنامے جو مسلمانوں سے طلب کیے جا رہے تھے، جوان پر بہ طور سزائے موت یا جلاوطنی مسلّط کیے جا رہے تھے، بعد میں جھوٹے سمجھے گئے، اور نتیجتاً قابلِ تعذیر۔ ان کی زبان جو کبھی مقدّس رہی تھی، اب ممنوعہ قرار دے دی گئی اور اس میں لکھی ہوئی کتابیں جلائی گئیں، اور یوں آہستہ آہستہ، لیکن یقینی طور پر اس دوسری چیز سے بدل دی گئی جو ہمیں ''کیہوتے'' کے بڑے بنیادی نویں باب میں ملتی ہے، اُس وقت جب راوی کے ہاتھ وہ موریسکو آتا ہے جسے وہ الہمیادو کی حیثیت سے بیان کرتا ہے۔ یہ سولھویں صدی میں اس زبان کا آخری اثر رہ گیا تھا جو ازمنۂ وسطا کے ہسپانیہ میں خود تمدّن کے قائم مقام تھی۔ اگرچہ الہمیادو ان لوگوں کو جو اسے پڑھ نہیں سکتے عربی جیسی دکھائی دیتی تھی— اور اسی وجہ سے ایک کائنات میں یہ عربی کہلاتی تھی کیوں کہ لوگ اسے اب اور نہیں پڑھ سکتے تھے— عربی بالکل نہیں تھی، بل کہ یہ تو وہ عربی رسم الخط تھا جس میں وہ رومانس بولی لکھی جاتی تھی جو اب ان ہسپانویوں کی مقامی اور اکثر اکلوتی زبان بن گئی تھی۔

الہمیادو ایک اور کیہوتانہ پیچ ہے، طلیطلہ کی چوٹی پر متمکن سان رومَن کے گرجے کی جعلی عربی آرائش سے کم مختلف نہیں— اگرچہ جس چیز نے اسے جنم دیا تھا وہ اس کے حسن کی عیسائی داد و تحسین سے کوسوں دور تھی جس کے باعث عربی خطّاطی بارھویں صدی میں ایک نئے عیسائی گرجے کی زیبائش کے لیے ایک موزوں سجاوٹ بن گئی تھی۔ سیفاراد سے دائمی جلاوطنی میں رہنے والے ہسپانوی یہودیوں کے درمیان بولی جانے والی بالکل لادینو ہی کی طرح، الہمیادو، اپنے عربی فقروں اور لفظوں کے امتزاج کے ساتھ، کستیلین تھی (جس طرح لادینو کے اپنے ملے جلے عبرانی فقرے تھے)، لیکن بہ ہر حال کستیلین ہی، اس کے باوجود کہ عربی لباس اور بھروپ میں، اور اس خوش نما عربی رسم الخط میں جو کسی ایسی چیز کا تاثر پیدا کرتا تھا جو اب اور حقیقی نہیں رہی تھی۔ یہ بے چارے موریسکوس کی مقامی زبان تھی، جن میں کے بیشتر، بلاشک و شبہ، خفیہ مسلمان تھے، اس بات کی شدید کوشش کر رہے تھے کہ مسلمان ہی رہیں اور اپنی عربی کو زندہ رکھیں لیکن ظاہر ہے ایک ایسی کائنات میں جہاں کتابوں کی زبان، حتّا کہ لوگوں کی زبان کا مقسوم بھی کھلے آسمان کے نیچے اَلاؤ میں خاکستر ہو جانا ہو، انھیں بہت زیادہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ الہمیادو، خود موریسکوس ہی کی طرح، سیروانتس کے اُسی مخزنِ حِیَل کا ایک حصہ ہے جو ایسی بے شمار چالوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن اس چال کو گھڑنے کی سیروانتس کو سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں تھی، کیوں کہ، جیسا کہ آوے یانیدا (Avellaneda) اور اس کے بدقماش ''حصہ دوم'' کا معاملہ ہے، تاریخی حقیقت نے یہ خود ہی اسے فراہم کر دی تھی۔ یہ صرف دیکھنے ہی میں عربی ہے، تاہم اصلی چیز سے کچھ کم خطرناک نہیں۔ اگر مریسکوس بڑے فخر اور مضبوطی کے ساتھ اپنی دکھاوے کی عربی کے ساتھ چمٹے رہے، تو اسے کیہوتانہ یقین— یا پاگل پن— کا زائیدہ عمل ہی کہا جا سکتا ہے۔ وہ اس چیز کو

پڑھتے اور لکھتے ہوئے پکڑے جانے کا خطرہ مول لے رہے تھے جسے عربی پر محمول کیا جا سکتا تھا اور جانی اعتبار سے اس کے بڑے خوف ناک نتائج نکل سکتے تھے، حال آں کہ ٹیپ ٹاپ کے نیچے، جسے ناٹک بازی کی سطح کہا جا سکتا ہے، یہ وہ زبان تھی جسے وہ بہ ہر حال ''کِریستیانو'' ہی کہتے تھے۔ اثر انگیز طور پر، جلاوطن سفارڈیم بھی اپنی ''کریستیانو'' یا ''لاطینی'' بولتے تھے، اور ''لادینو''، ان کی اپنی پندرھویں صدی کی ہسپانوی، اُس وقت سے سفاردی سرگردانی (ڈیاسپورا) میں مسلسل بولی جاتی رہی ہے۔

جدید ناول کی اصلی بنیادوں کو اور ان پیچیدہ ادبی سوالوں کو جو پورے طور سے ''کیہوتے'' کی ذُرّیت —— ایما بووری سے لے کر وہ جسے ہم طلسمی حقیقت نگاری (میجک ریل ازم) کہتے ہیں اس کے طلسماتی کہانی کاروں تک —— میں آگے چل کر اٹھنے والے ہیں، تو ان کو بڑی فنّی ہنرمندی سے ازمنۂ وسطا کے ہسپانیہ کے آخری سے آخری یادگاروں کی طرح تراشا گیا ہے۔ عربی کتاب کا ناموسوم مترجم، وہ گم شدہ اور بازیافتہ ''سچّی تاریخ'' جس کا سیروانتس متلاشی ہے، ناول کا سب سے زیادہ مثالی کردار ہے کیوں کہ پورے ناول میں بس وہی ایسی تاریخی شخصیت ہے جس پر کسی قسم کا ملمّع نہیں چڑھا ہوا ہے۔ وہ ٹھیک اسی کائنات سے آ رہا ہے جو سیروانتس کے مطابق فکشن کا فیصلہ کن نکتہ ہے، پڑھنے میں کسی فنتاسیے سے زیادہ دشوار؛ تاریخ بہ ذاتِ خود۔ یہ مترجم بہ ہر کیف عیسائی ملمّع کے نیچے سوائے ایک خفیہ مسلمان کے اور کون ہے، ایک خفیہ زبان کا شارح جو خفیہ کستیلین عربی کے بھیس میں ہے؟ طنزیہ طور پر، پیغمبرانہ طور پر، دردناک طور پر، یا ان سبھی طوروں پر، جس وقت سیروانتس ''کیہوتے'' کا دوسرا حصہ شائع کرتا ہے، موریسکوس اپنی الھمیادو تحریروں سمیت، وہ جعلی عربی جس میں انھوں نے تاریخ کے خاتمے کی بابت بڑی بھیانک کہانیاں لکھیں، فکشن کے اس منفرد کارنامے کے اندر ہی بچ رہتے ہیں جو سیروانتس کا ناول ہے۔

زیادہ تر دون کیہوتے کو ایک ایسے آدمی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جس کا حقیقت سے تعلق اس کے ادبی متون پر بہ ظاہر اعتماد کے ایسے رابطے سے ہے جو ایک گونہ دیوانگی کو پہنچا ہوا ہے۔ لیکن سیروانتس ایسی کائنات کی تصویر کشی کرتا ہے جس میں ادب سیاسی وابستگی کے مطالبات سے بچنے کی ایک جائے پناہ نہیں بل کہ بعض مخصوص نوع کے حقائق بل کہ اس سے بھی زیادہ استبداد کی غایت درجے کی متشدّد شکلوں کے خلاف سب سے زیادہ طاقت ور ہتھیار رہے۔ سیروانتس کی نشوونما، لامحالہ، خود اس کی تاریخ نے کی تھی، ایسے زمانے اور مقام نے جہاں کتب سوزیاں محض ادبی استعارے نہیں تھے بل کہ ایک بالکل جیتی جاگتی حقیقت۔ اس کے شاہ کار نے، جو مغربی [ادبی] آئین کے ہر گوشے میں جاگزیں ہے، ہمیں فکشن کی زندگی کو بدل دینے والی طاقتوں کا واضح ترین تصوّر عطا کیا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسے تصور سے کم نہیں جو سرتاسر تاریخی حقیقت میں رچا بسا ہوا ہے اور اس مسئلہ سے بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے کہ المیہ حقائق سے کیسے معاملہ کیا جائے۔ ''دون کیہوتے'' کا زیادہ تر مطالعہ ایسی کتاب کے طور پر کیا جاتا رہا ہے جو ''بہ ذاتہٖ'' ادب کی تاریخ اور عملیات میں دیوانگی کی حد تک مبتلا ہے، ادب بہ طور دیو جو پَون چکّیوں کی

’’حقیقتوں‘‘ کے قائم مقام بن جاتے ہیں، ایک کتاب جو کسی نہ کسی طرح تاریخ اور اس کے اتفاقی حوادث سے بچ نکلتی ہے۔ لیکن کیا یہ تصور کرنا سیروانتس جیسی خام خیالی نہیں کہ ہم اس ناول کو اس کے پیچیدہ اور دردناک تاریخی گرد و پیش کے باہر پڑھ سکتے ہیں، وہ گرد و پیش جس کی تفاصیل کو خود ’’دون کیہوتے‘‘ میں ٹھیک اسی لیے پیش کرنے کی حاجت نہیں کہ یہ اس کے مصنف اور خود مصنف کے پڑھنے والوں کے روزمرّہ کے مظاہر ہیں، اور جنھیں شاید جلائے جانے کی سزا کے باعث تفصیلاً بیان کیا بھی نہیں جا سکتا تھا؟

سولھویں صدی کی بہادر نئی دنیا کے نقطۂ نظر سے، قرونِ وسطا کے ساتھ قباحت یہ تھی کہ اس میں مذہب محض عقیدہ تھا، کوئی ایسی علاحدگی نہیں جو جوہری طور پر موجود ہو۔ اگر ایک جیسا لباس پہنے ہوں تو یہودی، مسلمان اور عیسائی میں کون فرق کر سکتا ہے؟ اُن بہت سے شیطانی اجزا میں جن سے احتسابی ہسپانیہ اور نئی دنیا کے بدنام ’’اِخلاصِ خون‘‘ جیسے تصورات کا خمیر اٹھا تھا، ٹھیک یہ حقیقت بھی شامل تھی کہ لوگوں میں کوئی ایسا نسلی فرق موجود نہیں تھا جو نظر میں آ سکے۔ اگر یہودی اور مسلمان ایک دوسرے سے متغایر نظر نہیں آتے تھے تاہم ان کے اختلافات فیصلہ کن تھے، تو پھر — جیسا کہ دون کیہوتے ہمیں بتانے سے کبھی نہیں تھکتا — ہونہ ہو یہ فرق صرف اسی جگہ پایا جا سکتا تھا جہاں یہ دکھائی نہیں دیتا تھا؛ یہ، یقیناً (ہم کیہوتے کو کہتے ہوئے سن سکتے ہیں)، بدخواہ جادوگروں کی کارستانی کے طور پر، صرف خون ہی میں ہو سکتا تھا۔ طرزِ سلوک کی نیرنگیاں تھیں، ضرور تھیں، لیکن ان کی جعل سازی کی جا سکتی تھی، جیسا کہ ہر کوئی جانتا تھا۔ اگر آپ ایک خفیہ یہودی تھے، تو آپ [اپنے مذہب کے] ممنوعہ کھانوں کو کھلے بندوں عوام میں کھاتے پھرتے، اس سے کماحقہٗ آگاہ کہ ایسا نہیں کریں گے تو پول کھل جائے گی اور آپ کو محکمہ [احتساب؛ اِنکوئی زیشن] کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ کونو یرسو اور موریسکو نے عیسائی طرزِ طعام میں اتنی شدید فنّی مہارت حاصل کر لی تھی کہ لامحالہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ ہسپانوی معاشرہ اپنے عیسائی استناد کی نمائش کے لیے کھلے بندوں اور بڑے رسمی طور پر ہیم [سؤر] کھانے کے آسیب کا شکار ہو گیا۔

اِس مخصوص شعبدہ بازی کے باب میں جس کا تعلق سیروانتس کے معاشرے میں فراواں تشخّصات اور حقیقتوں سے ہے، یہ سیروانتس کی شفّاف اور طنزیہ بصیرت ہی ہے جو موریسکو کو زور سے ہنس پڑنے پر مجبور کرتی ہے جب وہ اس مخطوطے کو پڑھنا شروع کرتا ہے جو راوی کو ملا ہے اور جسے اس نے ترجمہ کرنے کے لیے دیا ہے۔ موریسکو جب دُلسینیہ کی بابت حاشیے کی عبارت پر پہنچتا ہے تو بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ سیدھی سادی سگھڑ سی دہقان عورت، جسے بڑے شان دار طریقے پر فریبِ نظر کے شکار کیہوتے نے کوئی اشرافی خاتون سمجھ لیا ہے، حقیقت میں — جیسا کہ حاشیہ پر کسی لامعلوم اور شاید ملامتی ہاتھ نے توجہ دلائی ہے — ’’سارے لامانچا میں سؤر کو نمک چڑھانے والی عورتوں میں بہترین تھی۔‘‘ یعنی، بہ الفاظِ دیگر، اس کا تعلق بہترین کنو یرسو خاندان سے ہے۔ سولھویں صدی کے ہسپانیہ میں، اور یوں فکشن کے اِس شاہ کار میں جو ’’سچّی تاریخ‘‘ کی طرف مُڑ کر یاس اور

سرگردانی کے تقریباً یکساں احساس کے ساتھ نظر ڈالتا ہے، اشیا اکثر سر کے بل اور خرگوش کے بَھٹ میں نظر آتی ہیں: وہ عیسائی نظر آنے کے لیے جتنا زیادہ اس قسم کے جتن کرتی، اتنا ہی زیادہ قرین قیاس تھا کہ وہ محض عیسائی ہونے کا سوانگ ہی رچا رہی تھی۔ یا، جتنا زیادہ چوری چھپے، اور آخراً جتنے زیادہ المیہ طور پر، اس کے والدین یا نانا داداؤں نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنے عیسائی ہونے کا روپ دھارا ہوگا۔ رہی وہ، تو کون جانے کہ وہ زمانہ گزرنے کے بعد کیا ہوسکتی ہے؛ ایک نسل، یا ایک صدی، یا شاید اس سے بھی زیادہ وقت گزرنے کے بعد آپ بھول جاتے ہیں کہ جمعے کی رات اتنے چوری چھپے وہ موم بتّیاں آپ نے کیوں روشن کی تھیں؛ اُسے بھلا کہاں یاد رہا ہوگا کہ اتنا بہت سا نمک لگا سؤر کھانا اس حقیقت کا حصہ ہے جو اسے ہونا چاہیے تھا یا جو نہ ہونا چاہیے تھا۔

۱۴۹۲ کے بعد، ہسپانیہ کی قابلِ لحاظ آبادی کے مذاہب کو بڑی خوں خوار شدّت کے ساتھ کچلا اور بعد میں تہس نہس کر دیا گیا تھا۔ تصورات، کتابوں، اور لوگوں کے اگنی کھنڈوں سے ڈھل کر نکالنے والا یہ پُرفریب استعارہ بھی تھا کہ کوئی خالص قومی اور مذہبی تشخّص بھی ہوسکتا ہے، تاہم بعد میں یہی وہ مذہب بن گیا جس کے ساتھ سب کو گزارہ کرنا تھا۔ اگرچہ دون کیہوتے میں کتب خانے کی آتش زنی والے مشہور منظر پر اکثر یوں بحث کی جاتی ہے جیسے یہ محض کوئی خود حوالہ جاتی ادبی کنایہ ہو، کیا ہم واقعی یہ فراموش کر سکتے ہیں کہ یہ اس وقت رقم ہوا تھا جب نہ صرف کتابیں، جو بہ ہر حال سب سے زیادہ آتش گیر یادمحل ہیں، بل کہ خود انسانوں کو بھی نذرِ آتش کیا جا رہا تھا؟ یوں دیکھیں تو ''دون کیہوتے'' جزوی طور پر ایک درجۂ اوّل کے مقام کی پس نوشت ہے، اس کائنات کی گم گشتگی کا بڑا موثر نُدبہ، اس کا آخری باب، مرموز، طنز آفریں، کھٹ مِٹھا، کیہوتانہ۔ یہ شاید ہسپانیہ کے یادمحلوں میں سب سے آخری، بہترین، اور لطیف ترین یادمحل ہے۔ اس کی بے نظیر کستیلین اُس کستیلین کی براہ راست خلف ہے جو طلیطلہ میں مسلمانوں، عیسائیوں، اور یہودیوں کے چھوٹے سے گروہ میں ڈھلی اور پروان چڑھی تھی جو اس عظیم الشان عربی کتب خانے کو پہلے لاطینی اور پھر کستیلین میں ترجمہ کرنے میں ایک دوسرے کے شریکِ کار رہے تھے، جو ان سب کی مادری زبان تھی اور جس میں وہ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے تھے۔ الہمیادو اور لادینو، مقامی کستیلین کی وہ شکلیں جو طلیطلہ کے مترجمین کے اخلاف میں بولی جاتی تھیں، وہ خود اپنے طور پر کیہوتانہ جرات آمیزی کے یادمحل تھیں، بے وطنی اور آزاررسانی کی زبانیں جو مسلمانوں اور یہودیوں کی ''ہسپانیت'' کا دَم بھرتی تھیں۔

سولھویں صدی کے ہسپانیہ کی کہانی، جو عام طور پر اس کی قابلِ لحاظ امریکی ایمپائر کی کہانی کے طور پر سنائی جاتی ہے، یا اُن متون میں جدید ادبی جمالیات کے اچانک اضافے کی کہانی کے طور پر جو شیکسپیئر کی ہم سری کرتے ہیں، کسی طرح بھی ان دوسرے دو مذہبی تمدّنوں کے جبری فنا کر دیے جانے کی المیہ کہانی سے کم نہیں جن سے ہسپانیہ کبھی عبارت تھا۔ لیکن یہ المیہ کہانی — طلیطلہ میں ایک ماضی کو فراموش کر دینے کی کہانی جہاں ایک گرجا ہے جس کی دیواروں پر عربی خطّاطی کو خراجِ عقیدت

پیش کیا گیا ہے، اور جہاں ایک پُر تکلّف چودھویں صدی کا کنیسہ ہے جو اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ غرناطہ کے الحمرا کی طرح نظر آئے، اور جو کبھی یورپ کے وقیع ترین کتب خانوں اور فلسفیانہ اور علمی متون کے حد سے زیادہ محنتی مترجموں کی آماجگاہ تھا—اپنے عہد کی اُن دوسری کہانیوں سے جدا نہیں کی جاسکتی جو "دون کیہوتے دلا مانچا" اور موریسکوس کی جلاوطنی پر ختم ہوتی ہے۔ سیروانتس کا ناول اس طرح وضع کیا گیا ہے، ہمارے سامنے یوں پیش کیا گیا ہے کہ وہ اُس تاریخ کا ایک طفل—ایک سوتیلی اولاد— نظر آتا ہے جس کی بڑی بھیانک انداز میں قلب ماہیت ہوگئی ہے: عربی کتابیں اب ردّی ہیں اور یہودیوں کے محلّے میں جہاں اب کوئی یہودی نہیں رہ سکتا نادار بیوپاریوں کے ہاتھوں بیچی جارہی ہیں؛ اور یہ کتابیں ایک مسلمان کے ہاتھوں ترجمہ ہوں گی جو بہ مشکل ہی مسلمان ہے، ایک ایسا فرد جسے اپنے عیسائی ہونے کا سوانگ رچانا ہے اور جو، المیہ طور پر، واقعی عربی پڑھنے سے قاصر ہے۔ مضمر کہانیاں، اور خارجی کہانیوں سے ان کا ڈانواڈول ربط، جدید ناول کی ایجاد کی اس جدید ادبی جمالیات کے عین قلب میں جاگزیں ہے۔ اتنے ہی پیچیدہ اور کہیں زیادہ مخفی طریقوں پر، قرونِ وسطا کی یہ نیم گرفتہ اور نیم پوشیدہ دنیا امریکی ایمپائر کی کہانی میں دخول کرتی ہے، جس کی اولین چھان بین اور آبادکاری اس پہلی نسل کے بے شمار مہاجرین نے کی تھی جو الاندلس کے تمام قدیم علاقوں سے آئے تھے۔ وہ صندوق جو نئی دنیا کو لائے گئے تھے، لامحالہ، اس [جوہر] سے لبریز تھے جو وہ اندلسی تھے—ان کے پیراہن، ان کے کھاجے، ان کے خیال میں عمارتوں کو کیسا دکھائی دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ کیوبا اور جنوبی کیلی فورنیا کے صحن قرطبہ کے صحنوں سے اس درجہ مشابہ نظر آتے ہیں، وہ صحن جو بہ ذاتِ خود عبدالرحمٰن کی مہجوریِ وطن کی بڑی پیچیدہ بازگشت تھے: اندر کی طرف مائل اور نیلے اور سفید ٹائیلوں سے مرصّع، اور اگر تالاب کے گرد شاداب پھولوں کے درمیان کسی طرح ایک نخل بھی فراہم کرلیا جائے تو سبحان اللہ۔ ہسپانوی نئی دنیا کے امریکی ہر قبیل کے نجیب و شریف اندلسیوں کے اخلاف ہیں۔

سیروانتس کا ناول ایک شاہ کار ہے تو جزوی طور پر اس لیے کہ اسے اُس تاریخی ماحول کے باہر بھی پڑھا جاسکتا ہے جس سے اس کا خمیر اٹھا تھا، اور ہم مصنف کی اس جدوجہد کو سمجھ سکتے ہیں جو فرد کی "حقیقی" دنیا سے مخالفت کے وجودی مسئلے سے نپٹنے کے لیے اسے کرنی پڑی ہوگی۔ تاریخ کے ہر لمحے میں ہر فرد و بشر کی یہی کہانی ہے کہ ان گھنونی حقیقتوں کا، جن کے ساتھ اسے گزارہ کرنا ہے، مقابلہ کرے، ہوسکے تو ادب کی زائیدہ تسکین اور متون کی حکمت عملیوں کے ساتھ اور ان کے ذریعے۔ اور جب مُثُل (ideals) دل شکستگی کی بہیمانہ طاقت سے ٹکراتے ہیں تو ان پر کیا بیتتی ہے، یہ اس کی کہانی بھی ہے۔ مثالیت پسندی— جسے ہم کیہوتانہ مثالیت پسندی کہتے ہیں، جس کی سیروانتس نے اتنی جان دار عکّاسی کی ہے— تخیل کا ایک عمل ہے، اور شاید وہ عمل جس کی قسمت میں تباہی لکھی ہے، اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ ایک اچھی چیز ہے یا بری۔ داو پر جو اخلاقیاتی اور جمالیاتی سوال لگا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کس طرح حقیقت اور اپنی تاریخ سے معاملہ کرتے ہیں۔ جدید ناول

احتساب کی بڑی حقیقی آتشوں میں ڈھلا ہے، ایک ایسی تاریخی افتاد میں جس کی طرف خفیہ انداز میں بس اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے، اور یہ ہم سے جن باتوں کا طالب ہے ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم ان راہوں پر غور کریں جو فکشن کو جائے پناہ بنا سکیں، صرف ان معنی میں ہی نہیں کہ جہاں حقیقت سے فرار کیا جا سکے، بل کہ اس طور پر بھی کہ جہاں سر چھپایا جا سکے۔ من حیث قاری، آخراً ہمیں اس انتخاب سے نظریں چار کرنی ہی ہوں گی جو خود فکشن میں پیوست ہے: کیا ہم تاریخ کو فراموش کرنے کے لیے اس عظیم کہانی کو استعمال کرتے ہیں یا اسے یاد رکھنے کے لیے؟

(مطبوعہ ''دنیازاد'' (کراچی)، شمارہ ۲۰ (اگست ۲۰۰۷)، ۲۰-۳۳)

<mumemon@charter.net>